بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

برصغیر پاک و ہند سے اسلامی اقتدار ختم ہونے کے بعد اس سر زمین میں مسلمانوں کو اسلامی روایات سے وابستہ رکھنے اور ان میں دینی تعلیم کو ترویج دینے کے سلسلے میں ہمارے علمائے کرام نے جو شاندار خدمات سر انجام دی ہیں، وہ کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ اسلامی اقتدار کے دوران میں بادشاہ سے لے کر معمولی سے معمولی امیر و سردار تک جملہ ارکان حکومت مختلف طریقوں سے دینی تعلیم کی مالی کفالت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جہاں بھی کوئی ممتاز عالم درس و تدریس کی مسند بچھا کر بیٹھ جاتا اور طالبان علم کا اس کی طرف رجوع ہوتا اس درسگاہ کے نام معافیات کی شکل میں کچھ اراضی کی آمدنی وقف کر دی جاتی جس سے کہ پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کے مصارف پورے ہوتے رہتے تھے۔ اس دور میں اس قسم کی درسگاہیں ہر بڑے قصبے اور شہر میں پائی جاتی تھیں۔ انہی درسگاہوں کے فارغ التحصیل حکومت کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے بھرتی کئے جاتے اور وہ سلطنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے۔

اس زمانے میں ان درسگاہوں کی اسلامی سلطنت میں کم و بیش وہی حیثیت تھی، جو آج کے زمانے میں موجودہ سکولوں اور کالجوں کی ہے۔

اسلامی سلطنت ختم ہونے کے ساتھ مسلمان ارباب اقتدار کا کم و بیش وہ طبقہ بھی ختم ہو گیا، جو ان درسگاہوں کی مالی کفالت کرتا تھا۔ اس ضمن میں یہ بھی ہوا کہ وہ سب معافیات اور اوقاف بحق سرکار ضبط کر

لئے گئے ' جن کی آمدنی سے درس گاھیں چلتی تھیں ۔ اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی حکومت کے بعد جو نئی حکومت برسر اقتدار آئی ' وہ نہ صرف یہ کہ ایک غیر مسلم حکومت تھی' بلکہ اس کے علاوہ وہ ہزاروں میل دور سے آنے والی ایک اجنبی قوم کی حکومت تھی ' جس کی زبان تہذیب مذھب اور نظام حکومت مسلمانوں سے بالکل جدا تھا ۔ بلکہ سیاسی و مذھبی لحاظ سے یہ قوم مسلمانوں کی روایتی دشمن تھی ۔ چنانچہ جہاں اس نے مسلمانوں کو سیاسی طور پر زیر کیا ۔ وھاں اس کی یہ کوشش بھی تھی کہ وہ انہیں معاشی لحاظ سے اتنا مفلوج کر دے کہ وہ پھر سر اٹھانے کے قابل نہ رھیں ۔ پھر نئی حکومت میں غیر مسلموں بالخصوص عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں کو دین اسلام پر زبان طعن دراز کرنے اور مسلمانوں کو ان کے دین سے منحرف کرنے کی کھلی چھٹی تھی ۔ مزید بر آں ایک ایسا نظام تعلیم بھی بروئے کار آیا ۔ جس کا حتمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ مسلمان علوم دینیہ سے بالکل بے بہرہ ہو جائیں اور اسلامی تہذیب اور اس کی روایات سے ان کا رشتہ ہمیشہ کے لئے کٹ جائے ۔

برصغیر کی اس اجنبی غیر مسلم حکومت نے ایک تو '' تعلیم '' کے معنی صرف اپنے مذھب کی مخصوص تعلیم کے لئے ۔ وہ تعلیم جو اب تک مسلمانوں کے ھاں مروج تھی ' اسے سرے سے '' تعلیم '' ماننے سے ھی انکار کر دیا ۔ اور اس کو حاصل کرنے والوں پر حکومت کی تمام ملازمتوں کے دروازے بند کر دئیے ۔ دوسرے حکومت کی طرف سے تعلیم کی مد پر جو کچھ بھی صرف کیا جاتا ' وہ صرف نئے سکولوں اور کالجوں تک محدود کر دیا گیا ۔ غرض دینی درس گاھوں کی جن ذرائع سے مدد ھوتی تھی ' وہ بھی ختم ہو گئے اور ان کے فارغ التحصیل اصحاب کے سامنے معاش کی جو راھیں تھیں ' وہ بھی مسدود ہو گئیں ۔

اسلامی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد یہ صورت حال تھی ' جس سے کہ اس برصغیر کے مسلمانوں کو دو چار ھونا پڑا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس نازک مرحلے پر ھمارے علمائے کرام میدان میں نہ آتے اور دینی تعلیم کو عام

کرنے اور مسلمانوں کی معاشرت کو اسلامی روایات سے مربوط رکھنے کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہوتے تو اس برصغیر میں آج اسلامیت کے اتنے گہرے ، مؤثر ، ہمہ گیر اور فیصلہ کن اثرات نظر نہ آتے اور مسلمان بحیثیت مسلمان کے یہاں کی سیاسی و اجتماعی زندگی میں اتنا اہم کردار ادا نہ کر سکتے ۔ یہ سب فیض ہمارے علمائے کرام کی ان کوششوں کا ہے ، جو دین کے تحفظ ، دینی شعائر و روایات کی بحالی اور دینی تعلیم کو فروغ دینے کے ضمن میں خالصتاً لله فی الله کی گئیں ۔ جن کے طفیل '' فرنگیت '' کا بے پناہ سیلاب مسلمانوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکا ، اور ان کی اسلامی اجتماعیت بہر حال قائم رہی ۔

•

جہاں تک اسلام کے قدیم ورثے یعنی عقائد ، دینی علوم اور دینی روایات کو دست برد زمانہ اور خاص طور سے اجنبی استعمار کی تخریبی سرگرمیوں سے بچانے کا تعلق ہے ۔ اس میں علمائے اسلام کا بالعموم بڑا قابل تعریف کردار رہا ہے ۔ اور اس ضمن میں ان کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے ، کم ہے ۔ ہمارے یہ علماء حضرات ہی تھے جو اجنبی غاصبوں کے سیاسی اور مذہبی و تہذیبی استیلاء کی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور انہوں نے ہی مسلمان عوام کے اندر اس استیلاء کا مقابلہ کرنے کا زبردست جذبہ پیدا کیا اور انہیں غیرملکی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی ہمت دلائی ۔ بے شک علماء کرام کا یہ کارنامہ ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کبھی خود مسلمانوں کے اندر اصلاح احوال کی کوئی تحریک شروع ہوئی اور ظاہر ہے اصلاح احوال کے ہر اقدام کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے زمانے کی ضرورتوں کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں ۔ تو اس تحریک کی مخالفت کرنے اور اس کا راستہ روکنے والے سب سے بڑھ کر عام طور پر یہی علمائے اسلام ہی تھے ، صرف اس برصغیر میں نہیں ، بلکہ ہر اسلامی ملک میں اور ہر اسلامی اجتماع میں ۔ چنانچہ جہاں قدیم ورثے کی حفاظت میں ان بزرگوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئیے ، وہاں جدید زندگی کی تخلیق میں یہی بزرگ سب سے بڑھ کر سد راہ ثابت ہوئے ۔ یہ ہماری ملی تاریخ کا بہت بڑا المیہ

ہے اور یہی سب سے بڑا سبب ہے ہماری ملت کی پستی اور زبوں حالی کا۔

•

سید جمال الدین افغانی کسی کالج کے فارغ التحصیل نہ تھے، وہ قدیم مکتب فکر کے مستفید تھے، لیکن اپنے وطن سے باہر نکل کر جب انہوں نے دنیا کو دیکھا اور انہیں مسلمانوں کی جہالت و پستی اور دوسری قوموں کی ترقی و سربلندی کا احساس ہوا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو نئے علوم حاصل کرنے اور فکر و عمل میں تجدید کی دعوت دی تو ان کی سب سے زیادہ مخالفت علماء ہی کی طرف سے ہوئی، اور سوائے گنتی کے چند علماء کے، اکثر و بیشتر ان سے استفادہ کرنے والے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے غیر "علماء" اہل علم حضرات ہی تھے۔ خود اس برصغیر میں مولانا عبیداللہ سندھی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ خالص قدیم طرز کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے، اور ان کی ساری عمر اسلامی علوم پڑھنے پڑھانے گزری تھی، وہ کسی یورپی زبان کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے، لیکن جب وہ برصغیر سے باہر گئے انہوں نے مختلف ممالک کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے تاریخ کے بڑے انقلاب ہوئے، جو سرزمین حجاز میں چودہ برس کے قیام کے دوران خوب غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارا فکر، ہماری معاشرت اور ہمارے روایتی علوم سب فرسودہ ہو چکے ہیں اور اگر اس مشینی انقلابی دور میں مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے، تو انہیں اپنے اندر نیا فکر، نئی نظر اور نیا عمل پیدا کرنا ہوگا۔

مولانا مرحوم وطن لوٹے، تو یہ پیغام لے کر لوٹے، لیکن اس پیغام کی شدید ترین مخالفت خود ان کے اپنے طبقہ علماء ہی نے کی۔ اور زندقہ و کفر کے جو بھی اسلحہ تھے وہ ان کے خلاف استعمال ہوئے۔

•———

سید جمال الدین افغانی سے استفادہ کرنے والوں میں بعض روسی ترک اہل علم بھی تھے۔ اور انہوں نے اپنے وطن یعنی زار روس کی سلطنت میں جو ترک علاقے تھے، ان میں ایک بڑی صحت مند اسلامی اصلاحی تحریک کی داغ بیل رکھی تھی، یہ نوجوان ترک بیک وقت اسلام پسند اور قوم پرست

دونوں تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں نئی طرز کے مدارس کھولے ، اصلاح معاشرت کی انجمنیں بنائیں ۔ اخبارات جاری کئے اور ادبی رسائل نکالے لیکن ان ترک مصلحین کی زار روس کی حکومت نے اتنی مخالفت نہیں کی تھی، جتنی کہ وھاں کے قدامت پرست جامد علماء نے کی ۔ اور وجہ صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے نزدیک قدیم روایتی علم، قدیم روایتی معاشرت میں ذرا سی تبدیلی بھی بمنزلہ کفر کے تھی اور کفر کا مقابلہ کرنا وہ بزعم خویش اپنا فریضہ سمجھتے تھے ۔ اس قدامت پرستی نے روسی ترکوں کے ہاں ہر مفید اصلاح کا دروازہ بند کردیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی اکثریت کے یہ سارے علاقے بعد میں کمیونزم کا باسانی شکار ہوگئے -

سید جمال الدین افغانی کی تعلیمات کے زیر اثر روسی ترکوں میں اصلاح و تجدید کی جو تحریک شروع ہوئی تھی بعض، مبصرین کے نزدیک وہ اتنی جاندار تھی کہ اگر علماء کا قدامت پسند طبقہ اس کی مخالفت نہ کرتا تو زار کی حکومت اسے کبھی دبانے میں کامیاب نہ ہوسکتی ۔

—•—

جمہور علماء کی روایتی قدامت پرستی ہر اسلامی ملک اور ہر اسلامی اجتماع کی ترقی میں رکاوٹ بنی ہے - یورپی اقوام کے ہاتھ سے پیہم شکستیں کھانے کے بعد جب ترکوں کو اصلاح و تجدید کی شدید ضرورت محسوس ہوئی- اور سلطان محمود بعض یورپی اسالیب اختیار کرنے پر مجبور ہوا' تو علماء کی طرف سے دین کے نام سے اس کی مخالفت کی گئی ' لیکن چونکہ یورپ کے مقابلے میں زندہ رہنے کے لئے ترکی زندگی کو بدلنا ناگزیر ہوگیا تھا ، وہ لازماً بدلی گئی ۔ اور قدامت پرست علماء کی دخل اندازی بتدریج ختم ہوتی گئی' مصر میں بھی بعد میں یہی ہوا، گو اب بھی وھاں جامعہ ازھر موجود ہے - (اگرچہ اس دور میں اس میں بنیادی اور دور رس تبدیلیاں کردی گئی ھیں) علماء کی طرف سے حرمت و حلت کے فتوے بھی جاری ہوتے رہتے ھیں، اور انہیں کسی مسئلے کے متعلق اظہار رائے کی ایک حد تک آزادی ہے لیکن یہ کہ وہ اپنے کسی فتوے کے بل پر کوئی تحریک چلائیں ۔ اور حکومت کو اپنے پیچھے چلانے پر مصر ہوں ۔ تو اس کا وھاں اب کوئی امکان نہیں رھا ' مصر تو پھر " تفرنج زدہ " ملک ہے - وہ ملک جو کچھ عرصہ پہلے علماء کی صواب دید

کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، وہاں بھی اب بڑی سرعت سے زندگی بدل رہی ہے اور علماء کی قدامت پسندی کو اس میں مخل ہونے کی مطلق اجازت نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس دور میں ایک مملکت کا داخلی استحکام، بین الاقوامی سیاسیات میں اس کا اثر و نفوذ، اپنے باشندوں کی معنوی و مادی ضروریات کا پورا کرنا، انہیں کام پر لگانا اور ان کی معاشی کفالت کرنا۔ یہ ایسے مسائل ہیں، جن سے ہر حکومت کو فی الفور نمٹنا پڑتا ہے اور وہ مجبور ہوتی ہے کہ ان کا حل ڈھونڈے اور اسے نفاذ میں لائے۔ ان مسائل کے پیچھے پوری قوم کی ضرورتیں اور اس کے عملی تقاضے ہوتے ہیں، اور ان سے صرف اسی صورت میں عہدہ برآ ہونا ممکن ہے کہ مملکت کی ہئیت حاکمہ کی نظریں صرف قدیم پر مرکوز ہو کر نہ رہ جائیں، اور وہ پیش آمدہ مسائل کا حل محض روایات میں نہ ڈھونڈے، جس پر کہ ہمارے علماء کا اصرار ہے اور جسے وہ لازمہ دینداری قرار دیتے ہیں، بلکہ اس ہئیت حاکمہ کی نظریں قدیم کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل پر بھی ہونی چاہئیں، خوش قسمتی سے آج ہر اسلامی ملک کی ہئیت حاکمہ اسی مسلک پر گامزن ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس پر مجبور ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک کرکے تمام اسلامی ملکوں میں قدامت پرست علماء کا عمل دخل ختم ہو رہا ہے اور وہاں زندگی بڑی جرات سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔

ایک قوم کا قدیم ورثہ بڑی قابل احترام چیز ہے۔ اور اس کی بقا و دوام بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ ایک قوم کی معنوی زندگی کی اساس ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے وہ علماء جو اس قدیم ورثے کے حامل اور محافظ ہیں، ہمارے بڑے محسن اور ہماری حقیقی عقیدتوں کے مستحق ہیں لیکن اگر وہ اس قدیم ورثے کو اپنے من مانے معنی پہنا کر اسے روک بنائیں گے، تغیر و اصلاح کے ہر اس اقدام میں، جس کا آج کا زمانہ اور نئی زندگی کی ضرورتیں تقاضا کر رہی ہیں، تو لا محالہ اس قدیم ورثے کا بھی دلوں سے احترام اٹھ جائے گا۔ اور خود ان کا جو حشر ہوگا وہ تو معلوم ہی ہے۔